پروفیسر نیّر مسعود

اُستادِ محترم

(ڈاکٹر نذیر احمد صاحب)

فارسی میں ڈاکٹری کی سند اب جتنی سہل الحصول ہو گئی ہے، پہلے نہیں تھی۔ اس کا خاص سبب یہ تھا کہ جو اساتذہ تحقیقی مقالہ نگاروں کی رہنمائی کرتے تھے ان کا معیارِ تحقیق بہت بلند اور سخت ہوتا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ اُن کے زیرِ نگرانی لکھا جانے والا مقالہ اُن کے اس معیار کے مطابق ہو۔ میرے والد مرحوم پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیبؔ اس معاملے میں دوسروں سے کچھ زیادہ سخت تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کی طویل تدریسی زندگی میں اگرچہ کئی طالب علموں نے اُن کی نگرانی میں تحقیقی مقالہ لکھنا شروع کیا لیکن اُن کے معیارِ تحقیق کا ساتھ نہ دے سکنے کی بنا پر یا تو خود ہی ہار کر بیٹھ گئے یا ادیبؔ نے انھیں کوئی دوسرا شغل اختیار کرنے کا مشورہ دے کر اُن کی نگرانی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ جہاں تک مجھے علم ہے صرف ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے اُن کے زیرِ نگرانی مقالہ مکمل کر کے ڈگری حاصل کی۔ اسی لیے ادیبؔ مرحوم اپنے شاگردوں کی فہرست میں ڈاکٹر صاحب کا ذکر فخر کے ساتھ کرتے تھے۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی و اردو میں مجھے ڈاکٹر صاحب کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ اُس وقت بھی اُن کی بے تصنع انکسار آمیز شخصیت مجھے متاثر کرتی تھی۔ اُس زمانے میں یونیورسٹی کے اساتذہ خاصے ٹھاٹ باٹ سے رہتے تھے لیکن ڈاکٹر صاحب بہت سادہ، تقریباً مولویانہ، وضع قطع رکھتے تھے، اسی لیے جب میرے بعض ہم جماعتوں نے، جو ڈاکٹر صاحب کے ہم وطن تھے، یہ بتایا کہ ڈاکٹر صاحب بیڈمنٹن کے ماہر کھلاڑی ہیں تو مجھے یقین نہیں آیا۔ جھپٹ کر پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے والے اس کھیل کا تصور ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے ساتھ میل نہیں کھاتا۔ خود ڈاکٹر صاحب سے تصدیق کرانے کا موقع نہیں ملا، لیکن ہم جماعتوں نے مجھ کو یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ بتائی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کے علمی تبحر کا اندازہ تو اُس وقت کیا ہوتا، لیکن یہ دیکھتا تھا کہ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی علمی موضوع پر کام کر رہے ہیں۔ اُسی زمانے میں ڈاکٹر صاحب کا ایک بچہ خناق کے موذی مرض میں گرفتار ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب سخت پریشانی میں مبتلا اور اسپتال میں ساری ساری رات بچے کے سرہانے بیٹھے جاگتے رہتے تھے۔ ایک دن انھوں نے ادیبؔ مرحوم سے کہا کہ میں اسپتال میں رات بھر بیکار بیٹھا رہتا ہوں، تشویش کی وجہ سے نیند بھی نہیں آتی۔ اگر آپ اپنے کتب خانے کی کچھ کتابیں مجھے اسپتال میں لے جانے کی اجازت دے دیں تو وہاں ایک آدھ مضمون لکھ لوں۔ ادیبؔ

مرحوم اپنے ذخیرے کی کتابیں گھر سے باہر نہیں جانے دیتے تھے اور ان سے ''ادبستان'' ہی میں استفادہ کیا جا سکتا تھا، لیکن ڈاکٹر صاحب کو انھوں نے بہ خوشی اجازت دے دی۔ ڈاکٹر صاحب نے مطلوبہ کتابوں کی فہرست پیش کی اور ادیب نے سب کتابیں نکال کر اُن کے حوالے کر دیں۔ چند روز میں بچہ شفا پا کر گھر آ گیا اور ڈاکٹر صاحب نے ادیب کو اُن کی کتابیں واپس کرتے ہوئے بتایا کہ اسپتال کی ان شب بیداریوں میں قریب پچاس پچاس صفحے کے دو تحقیقی مقالے تیار ہو گئے ہیں۔ ادیب بہت متاثر ہوئے اور اس کے بعد اکثر جب علمی لگن کی بات ہوتی تو ڈاکٹر صاحب کے ان مقالوں کا ذکر کرتے تھے۔

○

لکھنؤ یونیورسٹی میں ڈاکٹر صاحب ہم لوگوں کو وقائع نعمت خان عالی پڑھاتے تھے۔ یہ فارسی کی مشکل ترین کتابوں میں ہے۔ اس کی لفظی اور معنوی صنعتوں، اشاروں کنایوں اور مدح کے پردے میں ذم کی کارستانیوں کا سمجھنا کم لوگوں کے بس کی بات ہے۔ ڈاکٹر صاحب وقائع کی عبارتوں کے ہر اہم لفظ کے مختلف معانی کی وضاحت کرتے، پھر عبارت کے ظاہری معنی بتاتے، پھر اس ظاہر کے پیچھے چھپے ہوئے مدعا کو بیان کرتے۔ متن کی تدریس کا صحیح طریقہ یہی ہے جس پر اب کم عمل کیا جاتا ہے۔ انھیں دنوں اردو کے ایک مشہور اور مقتدر نقاد (جو خود بھی معلم تھے) شعبے میں تشریف لائے۔ وہ واقعی ذی علم آدمی تھے لیکن انھیں اپنے ذی علم ہونے کا احساس اس سے زیادہ تھا جتنا ایک حقیقی عالم کو ہونا چاہئے۔ وہ شعبے کے اساتذہ سے گفتگو کر رہے تھے اور ہم طلبہ بھی باادب سن رہے تھے، لیکن مجھ کو ذرا ہی دیر میں اُن کا ادّعائی لہجہ اور قولِ فیصل کا سا انداز بُرا لگنے لگا۔ میں ''ادبستان'' کی صحبتوں میں مولانا امتیاز علی عرشی اور مولانا ضیا احمد بدایونی کے سے اکابر کی متین کسرنفسیاں دیکھ چکا تھا۔ ان بزرگ عالموں کی کسی بات میں علمی پندار کا شائبہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ خود ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی گفتگو میں مجھے آج تک ادّعائیت کی جھلک نہیں ملی، لیکن مذکورہ نقاد اس طنطنے کے ساتھ گرمِ گفتار تھے کہ معلوم ہوتا تھا احتشام صاحب بھی اُن کے شاگرد ہیں، اور احتشام صاحب اپنی خلقی مروت کی وجہ سے اُن کی ہر بات پر صاد کر رہے تھے۔ احتشام صاحب نے انھیں بتایا کہ لکھنؤ یونیورسٹی میں فارسی اور اردو کا مشترک شعبہ ہے۔ انھوں نے فارسی نصاب کے بارے میں دو تین سوال کئے، اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ یہاں پہلوی زبان نہیں پڑھائی جاتی، اس کے بعد پہلوی کے متعلق اپنی معلومات کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ اردو کے کسی نقاد کا پہلوی زبان کے بارے میں گفتگو کر سکنا قابلِ تعریف بات ہے لیکن انھوں نے کچھ اس طرح بولنا شروع کیا گویا انھیں اس زبان پر کامل عبور حاصل ہے اور اُن کے مخاطبین اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ابھی تک اُن کی بلند آہنگیوں پر خاموش تھے لیکن اب اُن سے نہیں رہا گیا (غالباً اُس وقت تک وہ ایران جا کر پہلوی زبان کا خصوصی مطالعہ بھی کر چکے تھے)۔ انھوں نے بہت ادب کے ساتھ نقاد صاحب کی کسی غلط بیانی کی تصحیح کی۔ موصوف نے ڈاکٹر

صاحب کو گھور کر دیکھا۔ مولویانہ وضع اور طالب علمانہ لہجے والے ایک غیر معروف معلم کی یہ جسارت انھیں پسند نہیں آئی اور انھوں نے تقریباً ڈپٹ کر اپنی بات دُہرائی۔ اب ڈاکٹر صاحب نے اتنے ہی ادب کے ساتھ اُن سے پہلوی کے متعلق دو تین سوال کر لیے۔ پھر دو تین سوال اور۔ ایک سوال غالباً ہُز وارش کے متعلق بھی تھا۔ نقاد صاحب نے کچھ بولنا شروع تو کر دیا لیکن اب صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ان سوالوں کے جواب تو دور رہے، اُن کی سمجھ میں سوال ہی نہیں آئے ہیں۔ اُدھر ڈاکٹر صاحب کچھ اور سوال کرنے کے لئے تیار نظر آ رہے تھے۔ آخر احتشام صاحب نے پہلے تو نقاد صاحب کو آنکھ سے خفیف سا اشارہ کیا، پھر نذیر صاحب کو بھی کچھ اشارہ کیا۔ نقاد صاحب خاموش ہو گئے، نذیر صاحب نے بھی کوئی اور سوال نہیں کیا اور یہ موضوع وہیں ختم ہو گیا۔

O

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی تحقیقی تحریروں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اب وہ خود بھی اُن کے اعداد و شمار نہیں دے سکتے بلکہ اپنی متعدد تحریروں کو وہ بھول بھی گئے ہیں۔ ایک بار میرے کسی تحقیقی کام کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ وہ خود بھی اِس موضوع پر "شاید" کچھ لکھ چکے ہیں۔ دیر کے بعد انھیں اپنے اس فراموش شدہ مقالے کا حوالہ یاد آیا۔ اس کا سبب اُن کے حافظے کی کمزوری نہیں بلکہ یہ ہے کہ جب وہ کسی ایک موضوع پر کام میں لگ جاتے ہیں تو پھر اُسی موضوع اور اس کے متعلقات کے ہو رہتے ہیں اور وہ موضوع اس طرح اُن کے ذہن میں بس جاتا ہے کہ بقیہ تحریریں وقتی طور پر حافظے کے نیم تاریک گوشوں میں چلی جاتی ہیں۔ اپنی تکمیل پسندی کی وجہ سے وہ موضوع کے ضمنی پہلوؤں کو بھی تشنۂ تحقیق نہیں چھوڑتے اور اس تحقیق کے دوران اسی موضوع کے متخصص ہو جاتے ہیں۔ کتاب "نورس" کا تعلق موسیقی سے ہے۔ اس پر تحقیق کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے قدیم فنِ موسیقی کے بارے میں بھی تحقیق کی، اور غالباً اسی کتاب سے متعلق تصویروں کے سلسلے میں فنِ مصوری کا بھی جائزہ لیا اور یہ دونوں ضمنی موضوع ان کی تحقیق کا اصل میدان معلوم ہونے لگے۔ یہاں تک کہ مشرقی موسیقی اور مصوری کے متخصص مستشرقین نے اپنے کاموں کے سلسلے میں ان سے رجوع کرنا شروع کر دیا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کے پاس مغربی ممالک سے آنے والے خطوں کے لفافوں پر ان کے نام کے ساتھ کبھی "صدرِ شعبۂ موسیقی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی" اور کبھی "صدرِ شعبۂ مصوری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی" لکھا جاتا تھا۔

اسی تکمیل پسندی کے باعث ڈاکٹر صاحب کی علمی تحقیق کے کئی تخصیصی میدان ہو گئے ہیں۔ ظہوریؔ پر ان کا تحقیقی مقالہ اس اہم شاعر پر واحد بڑا کام ہے۔ کتاب "نورس" کے ترجمے اور تدوین کے بعد سے وہ اس موضوع پر سب سے مُستند عالم تسلیم کر لیے گئے ہیں۔ مکاتیب سنائی کی ترتیب و تدوین نے ان کو ایران و افغانستان کے علاوہ ان سب ملکوں میں جہاں فارسی زبان و ادب پر کام ہو رہا ہے، فارسی کا ایک بڑا عالم اور محقق منوا لیا ہے۔ دیوانِ حافظ کے

قدیم مخطوطوں کی دریافت اور تدوین بھی ڈاکٹر صاحب کا بڑا کارنامہ ہے جس کا اعتراف ہندوستان سے زیادہ ایران میں کام کیا جا رہا ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کا شاید سب سے بڑا کارنامہ فارسی کے قدیم لُغات کی بازیافت، تدوین، تحقیق اور تنقید ہے۔ لسانیات اور کلاسیکی فارسی ادبیات کے میدانوں میں ڈاکٹر صاحب کی اس تحقیقات سے استفادہ ناگریز ہوگا۔ ہندوستان ہی نہیں ایران میں بھی اس بنیادی نوعیت کے کام کم ہوئے ہیں۔

غالبیات کے میدان میں بھی ڈاکٹر صاحب نے وقیع کام کیا ہے۔ ایک مستقل کتاب ''نقد قاطع برہان'' کے علاوہ انھوں نے غالبؔ کی بعض تلمیحوں مثلاً ترکانِ ایبک، قبچاق، خلخ، نوشاد؛ خسرو پرویز کے ترنج زر، دکت افشار وغیرہ پر جو تحقیقی مضامین لکھے ہیں وہ ایک طرف کلامِ غالبؔ کو پوری طرح سمجھنے کی راہ ہموار کرتے ہیں، دوسری طرف ہمیں یہ احساس بھی دلاتے ہیں کہ غالبؔ کے فارسی سرمائے پر ابھی بہت کم کام ہوا ہے اور یہ بھی کہ اس سرمائے کو نظر میں رکھے بغیر ہم غالبؔ فہمی کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر صاحب نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے اور اس سلسلے میں عملی قدم بھی اٹھایا ہے۔ غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کے بین الاقوامی سیمینار جو ڈاکٹر صاحب کے زیر اہتمام ہوتے ہیں، ان کے موضوعات میں غالبؔ کی فارسی نظم و نثر کو بالالتزام شامل کیا جاتا ہے اور اِدھر چند سال سے ان سیمیناروں میں ایران کے محقق اور نقاد بھی مدعو ہوتے اور مقالے پڑھتے ہیں۔ اس کا بہت خوشگوار اثر یہ مرتب ہوا کہ اب ایران میں غالبؔ کے مطالعے کا رجحان بڑھ رہا ہے ورنہ ابھی تک وہاں غالبؔ کو ژولیدہ فکر اور ناقابلِ فہم شاعر قرار دے کر نظر انداز کیا جا رہا تھا۔ مستقبل میں اگر غالبؔ کو ایران میں مقبولیت حاصل ہوئی تو یہ ڈاکٹر صاحب کا بڑا کارنامہ ہوگا۔

○

مزاح نگار شفیق الرحمٰن نے ایک صاحب کا ذکر کیا ہے جو بحث کرنے کے اتنے شوقین تھے کہ جب بحث کرتے کرتے تھک جاتے تھے تو ستانے کے لئے بحث کرنے لگتے تھے۔ یہ بات ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے شوقِ تحریر کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ جب وہ کچھ لکھنے سے فرصت پاتے یا تھک جاتے ہیں تو آرام کے طور پر کچھ اور لکھنے لگتے ہیں۔ گزشتہ سال (۱۹۹۴ء) ان سے علی گڑھ میں ملاقات ہوئی تو میں نے حسبِ معمول دریافت کیا کہ آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک تحقیقی کام کی تکمیل کی خوش خبری سنا کر بتایا کہ آج کل فرصت ہے اور اس فرصت کے وقت میں وہ فارسی کے اُن قصیدوں پر لکھ رہے ہیں جن میں حکومتوں اور حکمرانوں کے زوال کا ماتم کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں خاقانی کا قصیدہ ؎

ہان ای دل عبرت بین، از دیدہ نظر کن، ہان
ایوان مدائن را آئینہ عبرت دان

جو ایران کی عظمتِ رفتہ کا نوحہ ہے، خاقانؔی ہی کا ایک اور قصیدہ؛ غزوں کے ہاتھوں سلطان سنجر کی تباہی پر انوریؔ کا قصیدہ ۔

بر سمرقند اگر بگذری، ای بادِ سحر
نامۂ اہلِ خراسان ببر خاقان بر

اور ہلاکو کے منگولوں کے ہاتھوں بغداد کی بربادی، خلافتِ عباسیہ کے خاتمے اور خلیفہ مستعصم باللہ کے قتل پر سعدیؔ کا قصیدہ ۔

آسمان راحق بُوَد گر خون ببارد بر زمین
بر زوالِ مُلکِ مستعصم امیر المومنین

زیرِ تحقیق آئیں گے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب ڈاکٹر صاحب کی فرصت کا یہ حال ہے تو عدیم الفرصتی کا کیا حال ہوگا۔

○

امراض کے کئی حملوں اور ذاتی صدموں کو جھیلنے اور اَسّی سال کی عمر کو پہنچنے کے باوجود ڈاکٹر صاحب کی تصنیفی فعالیت اور تحریری سرگرمیوں میں انحطاط نہیں آیا ہے۔ وہ مرعوب کن علمی شخصیت کے مالک ہیں لیکن ان میں علمی پندار کا دور دور تک پتا نہیں، نجی صحبتوں میں وہ لطائف و ظرائف کے پھول بکھیرتے ہیں، خصوصاً اپنے بعض ہم پیشہ حضرات کے ایسے دل چسپ واقعات سناتے ہیں کہ محفل زعفران زار بن جاتی ہے اور وہ خود بھی کُھل کر ہنستے ہیں۔ غالباً اسی حسِ مزاح اور شگفتہ خاطری کی وجہ سے اُن پر ماہ و سال کی گردشیں زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکی ہیں۔ میں اُن کو ۵۰ء کے آس پاس جیسا دیکھا تھا کم و بیش ویسے ہی وہ مجھے اب بھی نظر آتے ہیں۔ میری دلی دعا ہے کہ وہ ایک عرصے تک تصنیف و تحقیق میں یک سوئی کے ساتھ منہمک اور خوش و خرم رہیں۔ ہندوستان میں فارسی کی جو حالت ہے اس کو دیکھتے ہوئے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اِس ملک میں اِس زبان کو اِس پائے کا دوسرا عالم اب نصیب نہ ہوگا۔

○

Adabistan, Deen Dayal Road
Lucknow - 226003 (U.P.)

فہرست

مشورت ادراک و ہشیاری دہد　　عقلہا را عقلہا یاری دہد (مولانا روم)

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے　　عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے (اقبال)

اکتوبر-نومبر-دسمبر ۲۰۰۴ء

ادراک گوپال پور

(۴)

زر سالانہ	۱۰۰ روپئے
لائبریریوں سے	۲۰۰ روپے
اس شمارے کی قیمت	۵۰ روپے
بیرون ممالک فی شمارہ	۵ ڈالر
سالانہ	۱۲ ڈالر

ترسیل زر کا پتا

ڈاکٹر نذر عباس

گوپال پور، باقر گنج، سیوان

بہار - ۸۴۱۲۸۶ (ہند)

فون نمبر - ۰۶۱۵۴-۲۷۲۳۳۱

مقالہ نگاروں کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی سیوان کی عدالت میں ممکن ہے۔

زیر اہتمام: مرکز تحقیقات اردو و فارسی گوپال پور۔ باقر گنج، سیوان۔ بہار (ہند)

کمپوزنگ : کمپیوٹر گیلکسی، حیتان نو پیر مارکیٹ کے سامنے، بڑا امندر روڈ، پٹنہ-۶، موبائل نمبر 0612-3337368

پرنٹر، پبلشر، اڈیٹر سید حسن عباس نے [illegible] چھپوا کر دفتر ادراک گوپال پور۔ باقر گنج، سیوان (بہار) سے شائع کیا۔

ادراک
گوپالپور
مدیر اعزازی
ڈاکٹر سید حسن عباس